رخصت اے بزمِ جہاں!

بہت صدمہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کی صف کا ایک کثیر الخدمات سپاہی ناوکِ اجل کا نشانہ بن گیا۔ مولانا گلزار احمد مظاہری بھیرہ ضلع سرگودھا میں مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۲۲ء کو حاجی عبدالمجید مرحوم کے دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اپنے ربِ غفور کی اُخروی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

مولانا نے قدیم و جدید دونوں طرح کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۷۵ء سے علما اکیڈمی بھی اسی غرض سے قائم کی کہ دونوں طرف کے سرچشمہ ہائے تعلیمی سے استفادہ کرنے والوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ ایف اے تک انگریزی تعلیم حاصل کی اور درسِ نظامی میں بھی سندِ فضیلت حاصل کی۔

۱۹۴۸ء میں جماعتِ اسلامی میں شامل ہوئے۔ شہروں اور دیہات میں تبلیغی اور سیاسی تقاریر کیں۔ مغربی اور عرب ممالک کی کانفرنسوں میں بھی خطاب کیے۔

مولانا گلزار احمد مظاہری مرحوم کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تفرقہ آلود فضا میں علماء کو متحد کرنے کی مہم شروع کی اور ۱۹۶۳ء میں جمعیت اتحاد العلمائے پاکستان قائم کی جس کے تحت پانچ ہزار علماء منظم ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے دوران کل پاکستان علماء کونسل قائم کی۔ ۳۱ مارچ کو بھٹو کے زیر اقتدار مسلم مسجد لاہور کے اندر اور باہر ان علماء پر بہیمانہ تشدد کیا گیا۔

سرگودھا میں مولانا نے جامعہ قاسم العلوم قائم کیا جس کو حکومت نے قومی تحویل میں لے لیا۔ ۱۹۸۰ء میں منصورہ کے متصل علماء اکیڈمی قائم کی۔

تقریباً نصف صدی کا دورانیہ رزم گاہِ خیر و شر میں محاذِ ایمان و اسلام سے معرکہ آرائی میں آخر دم تک گذار کر امتحان گاہِ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

خدا مولانا کی روح پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ اور تمام اعزہ و احباب اور رفقاء نے ان کی جدائی کا صدمہ جس صبر سے سہا ہے اس کا بہترین اجر دے۔ آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

شریعت بل کے پارلیمنٹ میں آنے کے بعد ہر وہ شخص یا گروہ مضطرب ہے جو لادینیت، انحراف پسندی، دُنیا پرستی، تقلیدِ فرنگ یا مخالفتِ اسلام کے مرض میں مبتلا ہے اور اپنے اپنے طبقے اور حلقے کی طرف سے جو تیر بھی چھوڑا جا سکتا ہو، ہر کوئی شریعت کے خلاف چھوڑ رہا ہے۔

اِسی سلسلے میں وہ افسوسناک موقع بھی ہمارے سامنے آتا ہے جب کہ حضور نبی اکرمؐ کے لیے قرآن کے استعمال کردہ لفظ "اُمّی" کا ایک غلط مفہوم حضورؐ پر چسپاں کیا گیا اور اس غلط مفہوم کے حق میں چند دانشور اصحاب، لغت در بغل میدان میں اُتر کر ذہانت کے شعبدے دکھانے لگے۔ حالانکہ وہ مفہوم ایسا غلط تھا کہ اس سے عہدۂ نبوّت کی توہین ہوتی تھی۔

لُغت، محاورے، شعر و ادب کی سندات، استعاراتی اور مجازی مفاہیم، ان سب پر جو بحثیں ہوتی رہی ہیں، مفسرین اور مترجمین نے جو جو کچھ لکھا ہے اس سارے سرمایۂ فکر و نظر کو ایک طرف رکھ کر ہم یہ حقیقت محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ لفظ نہ کوئی جامد شے ہے اور نہ لغت نے چند حرفوں کا ایک سانچہ بنا کر اس میں معنی کا جو مسالہ بھر دیا ہے وہ بس ہر جگہ یکساں اور اٹل رہے گا۔

لفظوں کے لغوی معنی کے علاوہ وہ معنی بھی ہوتے ہیں جو بولنے والے کی مخصوص ذہنیت، اس کی پسند و ناپسند، اس کے مخصوص رجحانات، اس کے کلام سے وابستہ سابق اور موجودہ ماحول سے اخذ ہوتے ہیں۔ اِس سلسلے میں قرآن سے ہم ایک بدیہی شہادت اخذ کرتے ہیں —— سورۃ المنافقون کی پہلی آیت میں حضورؐ کو آگاہ کیا گیا ہے کہ منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو

کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ بھی یہ جانتا ہے کہ آپ ضرور اس کے رسول ہیں، مگر اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔ کلام کی کیا عجیب نوعیت ہے کہ اربابِ نفاق جو بات کہہ رہے ہیں وہ سچی ہے، مگر سچ بول کر بھی وہ جھوٹے ہیں — اس سے معلوم ہوا کہ کلام یا لفظ کا مقام مشخص کرنے میں بولنے والے کی ذہنیت کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ براہ راست نیتوں سے واقف نہیں ہو سکتے، مگر نظریات، رجحانات، عادات، مشاغل، حلقہ ہائے ربط، پوری زندگی کے دروبست، تحریکی و تنظیمی کام کے مقاصد کو پس منظر میں رکھ کر موقعِ کلام پر نظر ڈال کر بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مدعا کیا ہے؟

بہت سے اصحاب لفظ "امی" کے معنی جاننے کے لیے لغت کے دفتروں کی طرف لپکے، مگر اپنے کلام کے سلسلے میں سب سے بڑی لغت تو خود عاصمہ جہانگیر ہے۔ وہ کس مسلکے ہیں کس ذہنیت کے ساتھ، کس فورم کو سامنے لیے، کس رُخ پر جانا چاہتی ہے۔ یہی سوال بتلائے گا کہ اُس نے جب اُمّی کا لفظ بولا تو اُس کی مراد کیا تھی۔

آیئے پہلے اس ذہنی کیفیت کو لیں جس میں عاصمہ جہانگیر گھری ہوئی ہیں۔ موصوفہ کے ایک حامی دانش ور نے ایک انگریزی اخبار سے یہ اقتباس نقل کیا ہے، اُسے بغور پڑھیے :-

"عاصمہ جہانگیر شریعت بل کو خواتین کے لیے ایک خطرۂ عظیم سمجھتی ہیں انھوں نے اُن مولویوں کی بات سننا مضحکہ خیز قرار دیا ہے جو کالے دھن کے سفید ہونے کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔ ان کی اخلاقیات اس وقت کہاں تھیں۔ انھوں نے کہا: ان کو صرف خواتین سے دلچسپی ہے۔ اُنھوں نے مزید کہا: اسلام انسانی حقوق یا انصاف اور برابری کے اُصول کے خلاف نہیں (اس کے بعد وہ مشہور فقرہ کہا گیا جس پر بحث چل رہی ہے، اس کو ہم آگے چل کر درج کریں گے)

(روزنامہ جنگ۔ شمارہ ۱۹ جون ۱۹۸۶ء، ص ۳)

اس اقتباس کو پڑھ کر غور کریں تو چند باتیں نمایاں ہوں گی۔ پہلی یہ کہ عاصمہ صاحبہ شریعت، شریعت بل،

یا اس کے نفاذ وغیرہ میں کوئی مثبت دلچسپی نہیں رکھتیں، کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی انہوں نے تحسین کی ہو، کوئی نکتہ ایسا نہیں جس پر ان کا دل خوش ہوا ہو، کوئی جملہ ایسا نہیں جس سے انہوں نے اتفاق کا اظہار کیا ہو۔ شریعت بل کے متعلق وہ ایک مخالفانہ کلمہ کہتی ہیں، یعنی یہ بل خواتین کے لیے خطرۂ عظیم ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ یہ کہتیں کہ غلبۂ شریعت یا نفاذِ شریعت میرا بھی اور جملہ مسلم خواتین کا بھی عین مقصود ہے، صرف اس کے ایک آدھ جزء سے اختلاف ہے اور اس اختلاف کے دلائل یہ یہ ہیں، وہ سارے بل کو "خطرۂ عظیم" قرار دیتی ہیں۔ اس سے انحرافِ دین یا شریعت گریز رجحان کی جھلک سامنے آتی ہے۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ عاصمہ جہانگیر شریعت بل کے مرتبین یا حامیوں کے نقطۂ نظر کی غلطیاں کتاب و سنّت سے ثابت کرتیں کہ تم نے فلاں جگہ قرآن کی اور فلاں جگہ حدیث کی مخالفت کی ہے، اُلٹا ایک نئی بحث اٹھا دیتی ہیں کہ جب کالے دھن کو سفید بنایا جا رہا تھا تو تم کہاں تھے؟ جو لوگ اُس وقت نہ بولے ہوں اُن کو یہ حق نہیں کہ قرآن و حدیث کے کسی اُصول و حکم کی تائید و تلقین کریں یا غلبۂ شریعت کی آرزو کریں یا کسی غیر اسلامی نقشۂ احوال کو درست کرنے کی سعی کریں۔

یوں اگر شرط لگا دی جائے تو عاصمہ جہانگیر اس وقت کہاں تھیں جب قومی اتحاد کے عَلَم کے تحت نوجوان سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے؟ یا اُس وقت کہاں تھیں جب شیخ رفیق اور چوہدری نذیر کو ظالمانہ انداز سے شہید کیا گیا؟ یا اُس وقت کہاں تھیں جب پاکستانی جہاز کو چھاپہ مار اغوا کر کے کابل لے گئے تھے؟ اور آئے دن رشوت ستانی، خیانت کاری، بدعنوانی، عصمت فروشی، مغرب کی حیا سوز ثقافت کا رقصِ بے محابا، اغوا، ظلم و تشدد اور شاہ راہوں پر گاڑیوں اور بسوں اور ٹرکوں پر لٹیروں کے جو حملے ہوتے ہیں، اُس وقت عاصمہ صاحبہ کہاں ہوتی ہیں؟ اور اگر ان سارے واقعات کے خلاف ان کا کوئی پارٹ نہیں ہے تو انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ پاکستانی معاشرے اور مسلمان خواتین پر کرم فرمائیں اور شریعت کے ذم زم کو جوشِ گفتار کے دامن میں چھپائیں۔

یہ کہنا کہ علمائے دین (مولویوں) کو صرف خواتین سے دلچسپی ہے (مراد ہے مخالفانہ دلچسپی)

عجیب بے تکی سی بات ہے۔ یہاں زکوٰۃ کے احکام زیر بحث آئے، یہاں سود کی حرمت اور بنکنگ بلا سود کا موضوع چھڑا، یہاں حدود و تعزیرات کے مختلف اصولی مباحث ابھرے۔ یہاں انگریزی قوانین کے کتاب و سنت سے ٹکرانے والے اجزا کو درست کرنے پہ کام ہوتا رہا، کیا یہ سب کچھ عاصمہ جہانگیر اور ان کی مجاہدات ترقی کے علم میں نہیں؟ پھر سوچنا چاہیے کہ اس طرح کی طعنہ بازیاں علمی اور سنجیدہ معاملات میں مناسب نہیں ہوتیں، ان چیزوں کا مقام گھروں کی چار دیواری کے اندر ہے۔

پھر فرمایا: اسلام انسانی حقوق یا انصاف اور برابری کے اصول کے خلاف نہیں۔ یہ "خلاف نہیں" بھی اسلام کی بڑی عجیب شان بیان ہوئی۔ یعنی اسلام نے خود تو کوئی انسانی حقوق متعین یا بیان نہیں کئے ہیں، نہ انصاف کے اصول اور کلیے طے کیے ہیں، نہ برابری کے معیارات بنائے ہیں۔ بلکہ یہ کام تو کچھ غیر اسلامی تہذیبوں نے اور معاشروں نے کیے ہیں اور ان کی علمبرداری خواتین کی ایک نمائندہ صاحبہ اس شعور کے ساتھ کر رہی ہیں کہ اسلام ان کے خلاف نہیں، آپ جو فہرست جن الفاظ میں حقوق کی بنا دیں اور جو قواعد اور طریقے انصاف اور برابری کے مقرر کر دیں، کیا مجال ہے اسلام کی کہ ان سے سرتابی کرے۔ سرتابی تو بس کرتے ہیں مولوی، لہٰذا ان کا گلا گھونٹنا ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ یہ فتویٰ تو عاصمہ جہانگیر اور ان کی قبیل کی خواتین دینی علم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ کر دیا کریں گی کہ کیا چیز اسلامی ہے اور کیا غیر اسلامی۔ پھر اگر ان کے اجتہادات پہ کوئی عالم دین چیں بجبیں ہوا یا کسی نے کوئی اختلافی آواز اٹھائی تو پھر وہ پہلے تو "مولوی" قرار پائے گا اور پھر ایسوں کی بات سننا مضحکہ خیز شمار ہو گا۔ اس پہ دین ترقی کی مفتیہ نامور نے بڑی محکم دلیل کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ مولوی (یعنی عالم دین) کے لیے اسلام کے دائرے کے اندر کوئی مقام ہے ہی نہیں۔ اسلام کو تو صرف غیر عالم قسم کے عامیوں اور جاہلوں سے واسطہ ہے۔ اسی برہان قاطع کو سامنے لانے کے لیے انہوں نے وہ مشہور فقرہ کہا جس میں استعمال شدہ لفظ "امی" کے ترجمے پہ بحثیں ہو رہی ہیں۔ وہ جس معنی میں اس لفظ کو لائی ہیں اس کا اندازہ ہماری اب تک کی گفتگو سے ہو سکتا ہے۔

اُنہوں نے فرمایا:

THE MOST BEAUTIFUL[1] THING ABOUT ISLAM WAS THAT IT WAS FOR THE LAYMAN AND WAS REVEALED TO AN "OOMI" (DAILY MUSLIM, RAWALPINDI)

اس کا ترجمہ کچھ اُوپر درج کردہ اقتباس کے ساتھ ان الفاظ میں شائع ہوا ہے:

"اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک عام آدمی کے لیے ہے اور ایک اُمی پر نازل ہوا ۔ دین کے ماننے والوں اور اللہ کے مابین کوئی مولویت حائل نہیں۔ پھر آخر علما اور اسلامی کونسل کی اسلام پر اجارہ داری کیوں؟"[2]

اس عبارت پر ذرا غور فرمائیے۔ یہاں لفظ (LAYMAN) کو "اُمی" کے متبادل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ سورۂ جمعہ میں ارشادِ خداوندی ہے کہ:

"وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسولؐ خود انہی میں سے اٹھایا... الخ"

یعنی قوم بھی اُمیوں کی قوم ہے اور ان میں سے نبی بھی ایک اُمی کو مبعوث کیا گیا ہے۔ اب ذرا عاصمہ جہانگیر صاحبہ کے ہاں اُمی کے ترجمے کو دیکھیے۔ وہ اُمی کے معنی (LAYMAN) قرار دیتی ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس پر باشعور اہلِ ایمان نے یہ محسوس کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی ہے۔

"اُمی" کے جو بہت سے معنی موصوفہ کی حمایت کرتے ہوئے اخبارات میں سامنے لائے گئے ہیں ان میں پست ترین مفہوم جاہل یا LAYMAN کا ہے۔ اس سے ذرا سا فرق "بے نوشت و خواند" کہنے میں ہے۔ مگر اس لفظ کے بارے میں عاصمہ تو کیا، ہمارے ممتاز دانشوروں نے بھی اتنا غور نہیں فرمایا کہ قرآن نے اُمی قوم کہتے ہوئے بھی اور نبی اُمی کہتے ہوئے بھی ایک طرح کا تعریفی و تحسینی

---

[1] بلکہ اس کا ترجمہ کرنا چاہیے کہ "مزے کی بات تو یہ ہے" کہ اسلام......!

[2] یہ صرف اس لیے کہ عاصمہ جہانگیر اور ان کی پیروکار خواتین کی اجارہ داری نہ چل سکے۔ جو علم کی بنیاد پر دلیل سے بات کرے، اس کی بات چلے۔

انداز اختیار کیا ہے نہ کہ معذرت خواہانہ اور منکسرانہ۔ پس اس لفظ کے معنی متعین کرتے ہوئے اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔ لفظ امی یا کسی دوسرے لفظ کو قرآن میں ایک منطوق سے ہٹا کر دوسرے پرے جانا یا مفہوم یا SENSE بدل دینا یہ تحریف کی ایک نوعیت ہے اور ساتھ ہی نبی کی شان میں سخت گستاخی کہ جن معنوں میں آپ کو اُمی کہا گیا اُن سے کم تر معنوں کا اطلاق کیا جا رہا ہے[1]۔ مزید غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ مشرکینِ عرب میں بھی کئی لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہاں اس کے دلائل دینے کا موقع نہیں، مگر "سبعہ معلقہ" اور "معاہدہ قریش بخلاف بنوہاشم" اور "معاہدۂ حدیبیہ" کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ اُمی تھے، اُمی کہلاتے تھے اور خود اپنے آپ کو بمسرت اُمی کہتے تھے۔ پس بعض خاص مواقعِ استعمال کو چھوڑ کر لفظ امی کا مقبول و معروف مفہوم دوسرا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد روایتیں اور قیاسات ہیں۔ حقیقت میں اس لفظ کا ایک منفی مفہوم تھا اور ایک مثبت۔ یعنی ایک طرف تو قومِ محمد بنو اسمٰعیل کہلاتی تھی اور اس کا نسب حضرت ابراہیمؑ سے ملتا تھا بلکہ ان میں مسلکِ ابراہیمیؑ بھی

---

[1] بعض لوگوں نے بے پڑھے لکھے ہونے کے الفاظ سے ترجمہ کیا ہے ان کا مقصد سرے سے وہ نہیں ہے جو عاصمہ صاحبہ کا ہے۔ وہ نبی کا درجہ گھٹانا نہیں چاہتے، وہ صرف ایک فن کے جاننے یا نہ جاننے پر بات کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ رسولِ برحق نے نبوت سے پہلے کے دور میں بھی دورِ یتیمی کی خودداری اور محنت کوشی، تجارت کی مہارت اور حجرِ اسود کی تنصیب کا جھگڑا چکا کر اور صدیق و امین کا لقب حاصل کر کے اپنے آپ کو صاحبِ علم ثابت کر دیا تھا۔ اور نبوت کے بعد تو خدا خود حضورؐ کا معلم بنا، یہاں تک کہ آپؐ معلمِ کتاب و حکمت قرار پائے اور اپنے متعلق مدینۃ العلم ہونے کا اظہار کیا، بلکہ حضورؐ کا سارا کارنامہ سیاست و فراست، ادبِ خطابت و مکاتیب، شجاعت و بصیرتِ میدانِ جنگ، عوام کی تعلیم و تربیت کے کمالات اور کارپردازیٔ اُمورِ خانہ اور قرآن کے علاوہ آپؐ کے اقوالِ زریں کے دفتر ہمارے سامنے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ حضورؐ کے اعلیٰ مراتبِ علم کو واضح نہیں کرتا۔ کیا اس کے باوجود آپ کو (LAYMAN) کا پیغمبر ہونے کی وجہ سے آج ہم اپنے معاملات سے بے دخل قرار دینے کی ناپاک جسارت کر سکتے ہیں۔

مروج و مقبول رہا۔ اگرچہ اس کی صحیح شکل مسخ ہو گئی تھی۔ کمی ان کے ہاں یہ تھی کہ حضرت خلیلؑ و اسمٰعیلؑ[1] کے بعد دورِ آنحضورؐ تک ان میں کوئی پیغمبر نہیں اٹھا اور کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ یعنی اُمّی قوم وہ بنو اسمٰعیل تھے۔ جن کے پاس قرآن سے پہلے کے صدیوں لمبے دور میں کوئی آسمانی کتاب نہ تھی۔ دوسری جانب وہ اس امر پر فخر کرتے تھے کہ ہم وہ قوم ہیں جس نے اپنے آپ کو عیسائیت اور یہودیت اور مجوسیت اور رُومی و ایرانی تمدنوں کے اثرات سے محفوظ رکھا ہے۔ یعنی اُن میں سے کسی مذہب اور تمدن کا علم حاصل کر کے اپنی سیدھی صاف بدوی فطرت کو داغدار نہیں ہونے دیا ہے۔ ہمارے ذہن بیرونی سامراجی اثرات کے بوجھ سے آزاد ہیں۔

ورنہ اگر وہ بات درست ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف (LAYMAN) کے لیے آئے تھے یا ایک جاہل قوم میں ایک بن پڑھی لکھی شخصیت کو مامور کیا گیا تھا تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اُس زمانے یا اس زمانے کا کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی حضورؐ کا مخاطب نہیں ہے۔ کسی وزیر، صدر، ممبر پارلیمنٹ، معلّم، وکیل، جج، سائنس دان، پائلٹ، جرنل، صحافی، ادیب اور کسی پڑھی لکھی خاتون کے لیے دین کے پاس کوئی تعلیم و ہدایت نہیں ہے۔ حالانکہ حضورؐ تمام سرزمینوں کی تمام قوموں کے لیے بلکہ ایک ایک فرد کے لیے تاقیامت تک نبی ہیں۔

یہ محض ایک منطقی نتیجہ ہی نہیں جو عاصمہ جہانگیر کی گفتگو سے ہم نے اخذ کر لیا ہو، بلکہ وہ دین و مذہب کے متعلق اپنا موقف خود یوں بیان کرتی ہیں:۔

> "وومن ایکشن فورم مذہب کے تقدیس پر پختہ یقین رکھتا ہے، اور اسلام اور دوسرے مذاہب کا بہت احترام کرتا ہے۔ ہم اپنے عقیدے کے اخلاص میں کسی بھی الزام پر غم و غصے کا اظہار کرتی ہیں۔ ہم پاکستان کی خواتین جائز حقوق کی راہ میں مذہب کو غلط استعمال کر کے رکاوٹ بننے والوں کی ہر کوشش کا مقابلہ کریں گی"
>
> (روزنامہ جنگ۔ ۹ اپریل ۸۶ء ص ۳)

[1] اسی کے لیے حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل نے دعا کی تھی کہ "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا" ... الخ

فورم کا بڑا احسان ہے کہ وہ مذہب کے تقدس پہ پختہ یقین رکھتا ہے (اگر یقین نہ رکھے اور مذہب کو مقدس نہ مانے تو کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے) اور اسلام اور دوسرے مذاہب کا بہت احترام کرتا ہے (یہ بھی بڑی مہربانی ہے کہ فورم ہر مذہب کا احترام کرتا ہے، اسلام کا بھی اور آتش پرستی کا بھی۔ احترام نہ کرے تو دنیا کیا کر لے گی)۔ یعنی مذہب کے بس تقدس پر یقین ہے، اس کے احکام و قوانین کے اتباع کا کوئی پروگرام نہیں۔ دوسری بات یہ کہ "اسلام اور دوسرے مذاہب" کو ایک سطح پہ رکھ کر ان کا احترام کرنے کا اعلان ہے۔ اسلام بھی بس ایک مذہب ہی ہے جس کے لیے فورم کی خواتین اپنے عقیدے کے اخلاص پہ کسی الزام کو گوارا نہیں کر سکتیں۔ یعنی لے دے کے بات عقیدے کی ہے، عمل کا کوئی قصہ نہیں، نہ نظام کا کوئی سلسلہ ہے اور نہ قانونِ شریعت کی کوئی گنجائش۔ خالی خولی عقیدہ اپنے دماغ کی کسی کھونٹی پہ ٹانگ دیا جائے۔ مذہب چونکہ خاموش رہتا ہے چاہے اُس سے ہر تعلق توڑ لیا جائے یا اس کی ہر پہلو سے حسبِ منشا تراش کر دی جائے۔ بولیں گے تو مذہب کو جاننے والے انسان ہی ہوں جو بولے سو مولوی۔ خاموش مذہب کا احترام تو ہو سکتا ہے، بولنے والے مولوی سے تو انسانوں کی طرح بات کرنا بھی ضروری نہیں۔

آیئے بھران کے ارشادات کی طرف۔ فرمایا: اگر خواتین کے "جائز حقوق" (کیا اُن کا جواز اسلامی نصوص و قوانین سے لیا جائے گا؟) کی راہ میں مذہب کو غلط طور پہ استعمال کیا جائے (اور غلط استعمال یہی ہے کہ عاصمہ جہانگیر اور ان کا فورم جن باتوں کو جائز حقوق قرار دے دے ان سے اختلاف نہ کیا جائے) تو اس طرح رکاوٹ بننے والوں کی ہر کوشش کا مقابلہ کیا جائے گا۔ دوسری طرف یہ بات ارشاد نہ ہو سکی کہ اگر مذہب کے مطالبوں اور احکامات کے راستے میں لوگ رکاوٹ بنیں گے تو ہم ان کی کوششوں کا مقابلہ بھی کریں گے۔ نہیں، صرف "جائز حقوق" کی راہ میں مذہب کو رکاوٹ بنانے والوں کا مقابلہ کیا جائے گا۔ دینِ ترقی کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب کا تو یہ کام ہی نہیں کہ وہ زندگی کے معاملات میں دخل دے اور نہ کسی کا حق ہے کہ اس کے اُصول و قوانین کو کسی مخالفِ مذہب چیز کے خلاف رکاوٹ بنائے۔ مذہب کو خاموشی سے یہ برداشت کرنا چاہیے کہ اُسے عقل اور ترقی کے تیشوں، چھینیوں سے آہستہ آہستہ تراشا جاتا رہے،

یہاں تک کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ بن کے رہ جائے۔ باقی رہی دنیا اور اس کے معاملات، سو اسے لوگ اپنی عقل سے چلاتے رہیں گے، جیسے لادین قومیں چلا رہی ہیں۔

مسلمان ملکوں میں محبانِ دین کی اکثریت کے مقابلے میں لادینیت پسندوں اور انحراف پسندوں کا اصل مسلک یہ ہے کہ بات کو دلیل کے راستے پر لانا ہی نہیں، کوئی بھی مسئلہ ہو اُس کے لیے خوب شور مچانا ہے، فقرے بازیاں کرنی ہیں، پارلیمنٹ میں فضا بنانی ہے، سیکولر مزاج صحافت کے اکھاڑوں میں کرشمے دکھلانے ہیں اور ہر دعویٰ دھونس سے کرنا ہے۔
اس کے لیے ایک جاہلانہ عذر بھی ہے۔ دلیل کی بات تو پھر علم کی بات ہوئی۔ علم کی بات چھڑی تو نبیؐ اُمّی کا لایا ہوا "مذہب" وہ نہ رہا جس کا اصل مخاطب جاہل آدمی (LAYMAN) ہے۔ پھر علم کی بات آئی تو علماء محفل میں آگھسیں گے اور اپنی بات کہنا چاہیں گے۔ اسی وجہ سے عاصمہ جہانگیر صاحبہ نے اوپر کے اقتباس میں جو شاندار دعوے کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی کوئی دلیل ـــــ خواہ وہ منصوص ہو، روایتی یا تاریخی ہو یا سائنسی یا عقلی ہو ـــــ نہیں پیش فرمائی۔ ان کے تصورِ اسلام کی رُو سے ایسی ہی بے دلیل دھونس سے کام چلانا چاہیے۔
آپ کا اصل کام یہ تھا کہ آپ خواتین کے سلسلے میں اسلام کے طے کردہ حقوق اور اعزازات کو خود قرآن و حدیث سے اخذ کردہ دلائل سے ثابت کرتیں اور پھر اپنے انتہائی "مغضوب" مولویوں کو بھی حق دیتیں کہ وہ جوابی دلائل لائیں۔ اس طرح سارا معاملہ دلیل کے زور سے حل ہوتا کہ قرآن و حدیث میں عورت کے لیے کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔
ہم گذارش کریں گے کہ جس کا جی چاہے لادینیت والی مسلمانی پر چلے، مگر اپنی تگڑم دھونس سے نہ لڑائے بلکہ غور و استدلال کا راستہ اختیار کرے، بتائے کہ قرآن میں عورت کے متعلق کیا کیا حقوق و فرائض وارد ہیں۔ خاندانی اور ازدواجی زندگی کے متعلق کیا احکام ہیں، گھر سے باہر کے کاموں کے لیے عورت جب نکلے تو اس کے لیے کیا ہدایات ہیں، قانونِ حجاب اور اخفائے زینت کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟ استدلال کے راستے سے اگر آپ یہ ثابت کر دیں

کہ عورتوں پر سرے سے کوئی پابندی ہی اسلام میں نہیں ہے، کسی آیت یا حدیث میں اُن کے لیے کسی امر میں کوئی تحدید یا قدغن نہیں ہے بلکہ ساری پابندیاں اور ساری تحدیدات صرف مردوں کے لیے ہی ہیں تو ایسی مدلل گفتگو کا ہم خیر مقدم کریں گے۔ آپ ثابت کریں کہ جو باتیں علماء کہتے ہیں وہ نہ قرآن میں ہیں، نہ حدیث میں ہیں، نہ صحابہ و تابعین میں، نہ محدثین و فقہا میں اور نہ مفسرین و متکلمین کے یہاں اُن کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ ایسا آپ ثابت کردیں تو کس عالم کی مجال ہے کہ وہ عورت کے متعلق زبان کھول سکے۔ لیکن استدلال صرف اس صورت میں وزن رکھتا ہے جبکہ جوابی استدلال کے لیے دروازے کھلے ہوں اور نسوانی قسم کی چیخم دھاڑ نہ مچا دی جائے۔ اب اگر علماء (یا مولوی)، دلائل کے زور سے ایک ایک آیت، اور ایک ایک حدیث اور صحابہ کرامؓ اور علماء و صلحائے اُمت کے متفق علیہ تصورات کو سچ ثابت کر دکھائیں تو پھر منطق و استدلال کی شریعت کا فتویٰ یہ بھی ہے کہ آپ کو سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔

آپ اپنے نقطۂ نظر کے حق میں اور علماء کے دعووں و تقاضوں کے خلاف بہ صد شوق عربی لغت و منطق اور سنتِ رسولؐ اور سنتِ امہات المومنین اور طریقِ صحابہ اور مسلماتِ اُمت کو زور و شور سے استعمال کریں اور ان بنیادوں پر اپنے نقطۂ نظر اور اپنے فورم کے منشور کو برحق ثابت کریں۔ معلوم نہیں یہاں کیا مصیبت آئی ہوئی ہے کہ اسلام کے خلاف عمل کرنے یا بات کرنے کے لیے کسی جدید ذہن کو ٹھوس استدلال کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسے لوگ نہ غور سے احکام و ہدایات کو پڑھتے ہیں اور نہ خدا و رسول کی باتوں کو جاننے کے بعد ان کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔ محض اپنی خواہشات اور جذبات کے زور سے جس بڑی سے بڑی حقیقت کی چاہیں، تردید کر دیتے ہیں اور جس جھوٹ اور یاوگی کو چاہیں اسلام کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ طریقہ نہ جمہوری ہے، نہ عقلی اور نہ دینی!

عاصمہ جہانگیر صاحبہ کو شدید غصہ ہے علمائے دین پر۔ ان کے وجود کو بے معنی بنانے کے لیے انھوں نے یہ حکیمانہ کلام پیش فرمایا ہے کہ کتنی اچھی بات ہے کہ جاہل لوگوں کے لیے ایک

اَن پڑھ کو نبی بنایا گیا اور خدا اور انسان کے درمیان کسی عالم کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ ہر جاہل آدمی بغیر کسی علم کے واصل بحق ہو سکتا ہے۔

مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آج اسلام کو سمجھنے کے لیے کم سے کم قرآن کو تو جاننے کی ضرورت ہے۔ پہلے عربی زبان سیکھنی ہوگی، پھر قرآن کے منشا کے مطابق تفکر و تدبر کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ عربی نہ سیکھ سکیں تو بدرجہ آخر آپ کو ایسے عالم کی ضرورت ہوگی جو قرآن کا ترجمہ آپ کے لیے کر کے دے۔ پھر آپ کو یہ جاننا ہوگا کہ اس کے مطابق قرآن کو لانے والے رسول نے عملاً کیا عقیدے سکھائے اور اُن کی تبلیغ کیسے کی؟ عبادات کیسے انجام دیں؟ اخلاقی لحاظ سے کیا نمونہ پیش کیا؟ حکومت و قضا کے معاملوں میں کیا طریقہ اختیار کیا اور کن اُمور سے منع کیا؟ دولت کے بارے میں کیا تعلیم دی؟ عورت کے لیے کیا حقوق و فرائض مقرر کیے؟ طریق بحث و استدلال کیا سکھایا؟ فیصلے کے لیے کسوٹی کیا مقرر کی؟ طریقہ ہائے اغیار کے بارے میں کیا رویہ متعین کیا؟ جنگ اور صلح کے معاملات کس طرح چلائے؟

اِن معاملات میں حضور کے قریب ترین اور تربیت یافتہ ساتھیوں نے ہمارے لیے کیا سامانِ ہدایت فراہم کیا؟ اُن کے بعد کے بے شمار محققین نے متذکرہ سوالوں کے جواب میں کن کن دلائل کی بنا پر کیا کیا رائیں دیں۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد ہی آج کے پیش آمدہ مسائل میں پورے اعتماد سے کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سارے علوم جن کی طرف اُوپر اشارہ ہوا جس شخص میں جمع ہو جائیں گے تو وہ تو آپ کے غضب آلود اندازِ فکر کے متعلق "مولوی" قرار پائے گا اور مولوی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ خدا اور عامی یا جاہل (LAYMAN) کے درمیان حائل ہو۔

دیکھیے محترمہ! دُنیا کے ہر نظام اور شعبے کے اپنے "مولوی" ہوتے ہیں جن کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مثلاً آج جو قانونی نظام چل رہا ہے اس کے مولویوں کو وکیل اور بیرسٹر کہتے ہیں۔ اب آپ قانون کی کوئی بھی دل پسند تعبیر کرتی ہیں تو پہلے آپ کو وکیل سمجھاتا ہے کہ یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ پھر اگر آپ نہیں مانتیں تو کوئی جج آپ کی من مانی تعبیر کی دھجیاں اُڑا دیتا ہے۔ آپ بھلا کیسے کہتی ہیں کہ انصاف اور میرے درمیان حائل ہونے والے ججوں اور وکیلوں کی کیا حیثیت ہے۔ مَیں جانوں اور انصاف جانے۔ خبردار جو کوئی دوسرا بولے تو!

تعمیرِ عمارت کے سلسلے میں صاحبِ عمارت کہتا ہے کہ انجینئر اور نقشہ نویس کون ہوتے ہیں جو میرے اور میرے تصورِ عمارت کے درمیان حائل ہونے کی جسارت کرتے ہیں۔ سیاست میں ریاست اور عوام کے درمیان کچھ لیڈر — صدر، وزرا اور پارلیمانی اراکین — حائل ہو جاتے ہیں۔ مریض کی صحت و سلامتی کے سلسلے میں ڈاکٹروں، ڈریسروں اور نرسوں کی ایک دیوار کیوں سامنے آکھڑی ہوتی ہے، علم اور طالب علم کے درمیان مدرسہ، مدرس اور کتبِ نصاب کیوں رکاوٹ بنیں ——— اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ معاشرے اور عوام کے درمیان آپ کا "فورم" کیوں مداخلتِ بے جا کا مدعی بن کے کھڑا ہو؟ اسے بھی اچھال کے پرے پھینکیے اور پھر بات کیجیے۔

مشکل یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا بنائی ہی اسی طرح ہے کہ آدمی ہر دائرے میں اہلِ علم کا محتاج ہے اور ان سے استفادہ کیے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔

قابلِ اعتراض صرف یہ بات ہوتی کہ وکیل صرف وکیل کا بیٹا ہوگا، لیڈر صرف لیڈروں کے خاص طبقے سے متعلق ہوگا اور عالمِ دین صرف علما کے مقررہ خانوادے سے اُٹھے گا۔ جس طرح کوئی وکیل آپ کو روکے ہوئے نہیں ہے کہ آپ مروجہ قانون کا مطالعہ نہ کریں، اسی طرح کوئی عالمِ دین آپ کو اس سے باز رکھنے کا مجاز نہیں ہے کہ آپ خود علمِ دین حاصل کر کے وہی برابر کی پوزیشن حاصل نہ کریں۔

آخر عورتوں کو بہ حیثیت ایک طبقے کے الگ محفوظ کر کے، علمائے دین کی جملہ تعداد کو جو طبقہ کی تعریف میں نہیں آتی، اپنی راہ میں مذہب کو رکاوٹ بنانے کا مجرم قرار دے کر آپ نامطلوب قرار دیتی ہیں تو اس قسم کی دھاندلی بازی کا کیا تعلق ہے قانون سازی سے یا مذہب سے یا علمی بحثوں سے! دنیا بھر میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قانون سازی کی بحثوں سے قانون کے علما کو نکال باہر کیا گیا ہو، یا مذہب کے مسائل چھڑیں تو مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کو ایک طرف ہٹا دیا جائے۔ یا کوئی علمی بحث فلسفے، تاریخ یا معیشت کے دائرے میں چھڑے تو پہلے محفل سے متعلقہ علوم کے جاننے والوں کو رخصت کر دیا جائے اور یہ محض اس اندیشے کا سدِباب کرنے کے لیے کہ جو غلط باتیں ہمیں کسی دائرۂ علم کے متعلق سوجھی اور راہ اختیار کر لی ہیں، ان

میں کوئی شخص اپنے علم اور استدلال کے ذریعے رکاوٹ نہ بن سکے۔

آخر میں ہماری گزارش یہ ہے کہ دین و دنیا کے اہم مباحث میں اپنی خواہشوں اور نفرتوں کو برتر قرار دے کر ہمیں ایسی بے تکی حرکات نہیں کرنی چاہئیں جن کی تائید نہ مذہب کرے، نہ جمہوریت، نہ عقل۔ گفتگو کے اچھے اسالیب پیدا کیجیے، جھگڑے کھڑے کرنے اور دوسروں کے تلخ جذبات کو اکسانے کے بجائے شائستگی کی فضا میں اختلاف کو لائیے۔ مگر اپنی باتیں جذباتی ہیجانات کے ساتھ نہ لائیے، بلکہ عقلی استدلال کے ساتھ لائیے۔

اور یہ بات ضرور سوچیے کہ کسی قوم کے مرد یا خواتین اپنے عقیدوں اور نظریوں، اپنے قانون اور اخلاق اور اپنی تہذیب اور ثقافت کو چھوڑ کر دوسروں کی غلامی و نقالی کرنے سے دنیا میں کبھی برتری حاصل نہیں کر سکتے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی بگھیوں میں جُتت جانے سے کبھی برتری اور ترقی نہیں ملتی۔ بلکہ دل و دماغ اُلٹا اور پست ہو جاتے ہیں اور احساسِ ذلت کے سرچشمے اندروں سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ "فورم" سے تعلق رکھنے والی تمام خواتین سے درخواست ہے کہ وہ مغربی معاشروں اور مغربی تحریکوں کی نقالی کو چھوڑیں۔ قرآن و حدیث کی بنیادوں اور اپنے دینی و تہذیبی مقاصد کے لیے اپنے آپ کو جمع کریں اور غیر خدا پرستانہ فکری و تہذیبی سامراج کے خلاف ہر گھر اور خاندان کو ایک مضبوط مورچہ بنا دیں۔

یہ وقت مردوں اور عورتوں کی کشمکش کے بجائے اس فیصلہ کن رویّے کا تقاضا کرتا ہے کہ کون مادہ پرستانہ تہذیب کے طور اطوار میں اپنے ساتھ ساری قوم کو جکڑ دینا چاہتا ہے اور کون خود بھی اور اپنے حلقہ اثر کے ہر بزرگ، دوست اور بچے تک کو خدا پرستانہ تہذیب کے محاذ کا سپاہی بناتا ہے۔

تو سوچنے کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے عاصمہ جہانگیر صاحبہ!